پروفیسر ڈاکٹر رؤف پاریکھ، کراچی
drraufparekh@yahoo.com

یادرفتگاں

شوکت سبزواری

چند سوانحی اور لسانی مغالطّوں کا ازالہ

(مغالطّوں میں تشدید نہیں ہے)

(ڈاکٹر شوکت سبزواری کی برسی کے موقعے پر خصوصی تحریر)

اردو میں یہ عجیب رواج ہے کہ جو شخص چند الفاظ کے استعمال یا تلفظ و مفہوم پر یا لغت پر چند مضامین لکھ لے وہ خود کو بالالتزام "ماہرِ لسانیات" لکھتا، لکھواتا اور کہلواتا ہے۔ یہ سب لسانیات کا حصہ ضرور ہیں لیکن چھوٹا سا۔ اصل لسانیات تو تشریحی لسانیات اور صوتیات ہے۔

ہمارے ہاں چند ہی لوگ تھے جو صحیح معنوں میں "ماہر لسانیات" تھے اور انھوں نے تاریخی و تشریحی لسانیات کا باقاعدہ مطالعہ کیا تھا یا تربیت لی تھی، ان میں سید محی الدین قادری زور، مسعود حسین خان، شوکت سبزواری اور گیان چند جین وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پیش کیے ہوئے لسانیاتی نظریات کارآمد بھی ثابت ہوئے اور ان پر وقت کی دھول بھی نہیں پڑی ورنہ لسانیات کے نام پر لکھا گیا بہت سا رطب و یابس وقت کی آندھی اڑا لے گئی۔ انھی چند لوگوں کی وجہ سے برعظیم پاک و ہند کی تمام زبانوں میں لسانی و لسانیاتی تحقیق کے میدان میں اردو سب سے آگے تھی۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں محی الدین قادری زور کی لسانی تحقیق سائنسی بنیادوں پر استوار تھی اور اس وقت تک ہندی میں لسانیات پر بہت کم کام سائنسی انداز میں ہوا تھا۔ افسوس کہ آزادی کے بعد ہمارے ہاں لسانیات کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہیں کیا گیا اور یونی ورسٹیوں میں شعبہ ہاے اردو ہی کو لسانیات کی تدریس کی ذمے داری دے دی گئی۔ شعبۂ ہاے اردو کے سربراہان بہت محترم ہیں، لیکن شعبۂ اردو کی سربراہی کوئی ادبی شخصیت یا ادب کا عالم کر رہا ہوتا ہے جبکہ لسانیات ایک الگ علم ہے اور موجودہ دور میں اسے "زبان کا سائنسی مطالعہ" سمجھا جاتا ہے۔

ہندوستان میں آزادی کے فوراً بعد لسانیات اور اس کی تدریس کی طرف توجہ دی گئی اور وہاں کئی ادارے خالصتاً لسانیات کی تعلیم کے قائم کیے گئے اور ہمارے ہاں "لشکری زبان"، "پنجاب میں اردو" اور "دکن میں اردو" جیسے غلط نظریات کو لسانیات کی معراج سمجھ لیا گیا۔ آج پاکستان کی صرف چند سرکاری یونی ورسٹیوں میں لسانیات کا باقاعدہ شعبہ قائم ہے۔ باقی جامعات میں شعبۂ اردو یا شعبۂ انگریزی "لسانیات" کے ذمے دار ہیں۔ اردو والے لسانیات کو الفاظ ومحاورات کے درست استعمال تک یا "اردو زبان کے آغاز کے نظریات" تک محدود سمجھتے ہیں اور انگریزی والے ایم اے انگریزی اور ایم اے لسانیات کے نام پر تدریس انگریزی کے کورس پڑھا رہے ہیں جو کالجوں کے لیے انگریزی کے استاد پیدا کر سکتا ہے۔ وہاں اگر لسانیات پڑھائی بھی جاتی ہے تو انگریزی زبان کی حد تک، اردو کے مصوتوں (vowels) اور مصمتوں (consonants) تک سے انگریزی لسانیات کا طالب علم واقف نہیں ہوتا۔ ادھر ہندوستان میں خالص لسانیات اور ہندی لسانیات پر اتنا کام ہوا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اردو والوں کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ لسانیات کا ذکر یوں نکل چلا ہے کہ شوکت سبزواری کا ذکر آرہا ہے۔

> شوکت سبزواری کی اصل شہرت ان کے لسانی کاموں کی بنا پر ہے، اس سلسلے میں ان کا پہلا کام ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جو "اردو زبان کا ارتقا" کے عنوان سے ڈھاکا سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اردو مسلمانوں کی ساختہ نہ سہی پرداختہ ضرور ہے

پاکستان کے معدودے چند ماہرین لسانیات میں ڈاکٹر شوکت سبزواری بھی شامل تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اگرچہ مدرسے میں ہوئی تھی لیکن اسی نے ان میں زبانوں کے علم سے دل چسپی اور مہارت پیدا کر دی اور انھوں نے اردو زبان کی تاریخ سے متعلق بیش بہا تحقیقی کام کیا۔ لغت اور قواعد پر ان کی گہری نظر تھی۔ شوکت سبزواری ادبی تنقید کا بھی ایک اہم نام ہے۔

سوانحی تفصیلات

سید شوکت علی نام تھا لیکن شوکت سبزواری کے نام سے لکھا اور اسی نام سے معروف ہوئے۔ سبزواری کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ ان کے آبا و اجداد مغلیہ دور میں سبزوار (ایران) سے ہجرت کر کے برعظیم پاک و ہند آئے تھے اور بلند شہر کے قریب مرزا پور میں آباد ہوئے۱۔ بعد ازاں ان کے دادا سید نیاز علی مرزا پور سے میرٹھ منتقل ہو گئے۲۔ شوکت سبزواری کی تاریخ پیدائش کے ضمن میں اختلاف ہے۔ مالک رام نے لکھا ہے کہ شوکت سبزواری کا سالِ پیدائش بالعموم ۱۹۰۸ء بتایا جاتا ہے لیکن "قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۹۰۵ء/ ۱۹۰۶ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے تھے"۳۔ مالک رام نے یہ نہیں بتایا کہ وہ "قرائن" کیا ہیں۔ البتہ خود شوکت سبزواری نے اپنی جائے پیدائش اور مقامِ پیدائش کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "میں مغربی یوپی کے شہر میرٹھ میں پیدا ہوا"۴۔ لیکن ان کی تاریخِ پیدائش جس یادداشت میں لکھی گئی تھی وہ ضائع ہو گئی اور بقول خود ان کے "میں نے قرائن سے اپنی پیدائش کا سن ۱۹۰۸ء متعین کیا ہے"۵۔ گویا مالک رام کا اندازہ درست نہیں ہے اور خود شوکت سبزواری صاحب کی متعینہ تاریخِ پیدائش کو درست ماننا قرینِ قیاس ہوگا۔

مالک رام نے لکھا ہے کہ شوکت سبزواری کے والد سید اسد علی نے اپنے بڑے بیٹے حشمت علی کو اسکول میں داخل کروایا لیکن وہ کئی سال تک میٹرک میں فیل ہونے کے بعد بیمار ہو کر انتقال کر گئے۔ اسد علی نے اس بچے کو انگریزی پڑھوانے کا وبال سمجھا اور طے کیا کہ اب کسی بیٹے کو تعلیم نہیں دلوائیں گے۔ لہٰذا شوکت سبزواری خاصے عرصے تک تعلیم سے دور رہے۶۔ لیکن شوکت سبزواری نے خود اس طرح کی کوئی بات نہیں لکھی اور نوعمری میں اپنے کھلنڈرے پن کو اپنی تعلیم سے محرومی کی وجہ بتایا ہے اور بقول ان کے 'معمولی عبارت بھی نہ پڑھ سکنے پر ہم عمر ساتھیوں کی حقارت کا نشانہ بننے اور مسابقت کے جذبے کی وجہ سے ان میں حصولِ علم کا شوق پیدا ہو گیا۷۔ بالآخر انھیں ایک استانی کے پاس قرآن شریف پڑھنے بٹھا دیا گیا۔ استانی صاحبہ نے انھیں اردو پڑھنا بھی سکھا دیا البتہ لکھنا نہیں سکھایا کیونکہ یہ ان کے مرحوم خاوند کی وصیت تھی۔ کم سن شوکت سبزواری نے خود ہی کسی طرح لکھنا شروع کیا اور چل نکلے۸۔ بقول مالک رام، بڑے بیٹے کو انگریزی پڑھوانے کے "کفارے" کے طور پر شوکت سبزواری کو والد نے

میرٹھ کے مدرسہ'' امدادالعلوم'' میں داخل کرایا۹لیکن شوکت سبزواری نے ''کفارے'' کا کوئی ذکرنہیں کیااورلکھاہے کہ محلے کی مسجد کے امام نے ان کے (شوکت سبزواری کے) والدکو مشورہ دیا کہ اپنی اوراپنے بزرگوں کی ''نجات'' کے لیے بچے کو مدرسے میں تعلیم دلوایئے، چنانچہ وہ مدرسے میں داخل کرائے گئے۔لیکن شوکت سبزواری نے اس مدرسے کا نام امداد العلوم نہیں بلکہ 'امداد الاسلام'' لکھاہے۱۰۔مالک رام کو یہاں التباس ہواہے۔

اس مدرسے میں اس دور میں بعض معروف اورجید اساتذہ حدیث،فقہ،عربی،فارسی اورمنطق پڑھاتے تھے۔ان میں مولانا عبدالمومن دیو بندی بھی تھے جو شیخ الہند مولانامحمودحسن کے سالے تھے اور حدیث اور فقہ میں ممتاز تھے۔مولانااختر شاہ عربی وفارسی ادب پڑھاتے تھےاوراردو، فارسی اورعربی میں شعر کہتے تھے۱۱۔عربی فارسی کی مہارت، منطقی استدلال اورادب کا صحیح ذوق شوکت سبزواری کو غالباً انھی اساتذہ کا عطیہ تھا۔اسی زمانے میں انھوں نے ہندی اور انگریزی بھی پڑھنا شروع کی۱۲۔شوکت صاحب نے۱۹۲۴ء میں مولوی فاضل اور ۱۹۲۷ء میں منشی فاضل کے امتحانات کامیاب کیے اوراپنے طور پر انگریزی بھی پڑھتے رہے۔ ۱۹۲۶ء میں دسویں بھی پاس کرلی تھی۱۳۔

شوکت سبزواری ۱۹۲۸ء میں ایک ہفت روزے کے مدیر ہوگئے جوان کے ایک عزیز''صداقت'' کے نام سے نکالتے تھے۱۴۔سال بھرتک یہ رسالہ چلااوراس کے بعد بقول خودان کے انھیں لکھنے کی ''چاٹ'' پڑگئی اوران کا پہلا باقاعدہ ادبی مضمون''نگار'' میں شائع ہوا۱۵۔

شوکت سبزواری ۱۹۳۰ء میں مدرسہ عالیہ(میرٹھ)میں فارسی اور اردو کے استاد مقرر ہوگئے۔ اسی دوران میں ایک آریہ سماجی ادارے کی طرف سے مدرسے میں کہلوایا گیا کہ ہم عیسائیوں اورمسلمانوں سے مناظرہ کرتے ہیں آپ لوگ بھی آیئے۔لیکن مدرسے کے منتظمین مناظروں کوتضیع اوقات سمجھتے تھے اس لیے اس دعوت کوقبول نہیں کیا گیا۔البتہ شوکت سبزواری نے اسے چیلنج سمجھ کر ذاتی طور پر قبول کرلیا ۔اس مناظرے میں بقول خود ان کے نوآموز ہونے کے باوجوددو گھنٹے تک پنڈت جی سے بحث کرتے رہےاور بالآخر پنڈت جی نے انھیں بہت سراہا۱۶۔لیکن مالک رام نے اس مناظرے کانتیجہ یہ کہہ کرنظرانداز کردیاہے کہ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ۱۷۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس مناظرے کا ایک اہم نتیجہ نکلا اور وہ یہ کہ شوکت سبزواری کو احساس ہوا کہ جب تک ہندی اور سنسکرت کا باقاعدہ مطالعہ نہ ہوآریہ سماجیوں سے مناظرہ کرنا مناسب نہیں۔چنانچہ انھوں نے ایک پنڈت سے باقاعدہ سنسکرت کے سبق لیے اور ہنود کے مذہبی متون انھیں کی زبان میں مطالعہ کیے۱۸۔اس طرح انھیں سنسکرت پر بھی اچھا خاصا عبور ہوگیا جو بعد میں لسانیاتی تحقیق اور بالخصوص اردو کے آغاز کے ضمن میں پراکرتوں کے کردار کے مطالعے میں ان کے بڑے کام آیا۔

اس مدرسے میں وہ ۱۹۴۱ء تک رہے اور اس عرصے میں انھوں نے پرائیویٹ طور پر انٹر، بی اے اور ایم اے (فارسی) کرلیا۔ ۱۹۳۷ء میں ایم اے فارسی کے بعد ۱۹۳۹ء میں ایم اے عربی کیا ۱۹۔ مدرسہ عالیہ (میرٹھ) کی ملازمت جاری رکھتے ہوئے انھوں نے میرٹھ کالج سے ایل ایل بی اوراردو میں ایم اے بھی کرلیا۲۰۔عربی، فارسی اوراردو میں ایم اےاورایل ایل بی کے بعدشوکت سبزواری بریلی کے اسلامیہ کالج میں۱۹۴۳ء میں شعبۂ فارسی واردو میں استادمقرر ہوئے۲۱۔ قیام بریلی کے عرصے میں انھوں نے اپنی پہلی کتاب ''فلسفۂ کلامِ غالب'' تحریر کی۔یہ۱۹۴۶ء میں پہلی بار بریلی ہی سے شائع ہوئی۲۲۔

مالک رام نے''تذکرۂ معاصرین''میں نجانے کیوں یہ لکھ دیاہے کہ شوکت سبزواری کانگریس کے حامی اور ''ہمیشہ قوم پرست'' (یعنی متحدہ ہندوستانی قومیت کے حامی) رہے۔ نیز یہ کہ وہ ہندوستان سے جانا نہیں چاہتے تھےلیکن ہندوستان میں اردو کے خلاف فضا دیکھ کر (شکر ہے کہ مالک رام نے یہ اعتراف تو کیا کہ ہندوستان میں فضااردو کے خلاف ہو چلی تھی) ان کو اندیشہ ہوا کہ میری نوکری جاتی رہے گی اور وہ ۱۹۵۰ء میں عندلیب شادانی کے بلانے پر ڈھاکا یونی ورسٹی چلے گئے۲۳۔حالانکہ شوکت سبزواری ہمیشہ سے اسلامی ذہن کے حامل تھےاور پاکستان آنے کے بعداسلامی ادب کی تحریک اور پاکستانی ادب کی تحریک کے بھی حامی رہے۔ ان کی کئی تحریروں سے ظاہر ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات سے بہت متاثر تھے۔مثلاً ان کی کتاب ''معیار ادب'' میں ان کا مضمون ''اسلامی ادب'' پڑھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کانگریس کے حامی اورقیام پاکستان کے مخالف تھے۔اس مضمون میں انھوں نے فراق گورکھ پوری کی اس تحریر پرشدید تنقید کی ہے جس میں فراق نے ہندوستان اور پاکستان کی مشترک تہذیب وتمدن اور اکھنڈ انسانیت کی بات کی تھی۔ان کے کئی اورمضامین میں بھی یہ رنگ جھلکتا ہے۲۴۔اسی کتاب میں شامل ان کے ایک مضمون کا عنوان ہے''اقبال اور اسلام کے اولیں اصول''۔ مالک رام کی نظر سے یہ کتاب غالباً نہیں گزری تھی ورنہ وہ شوکت سبزواری کوکانگریس کا حامی کبھی نہ لکھتے۔

مالک رام نے اپنی مذکورہ بالاکتاب میں لکھاہے کہ شوکت سبزواری ڈھاکا (مشرقی پاکستان) پہنچ کر وہاں یونی ورسٹی میں صدرِشعبہ 'اردو ہوگئے۲۵۔یہ بھی درست نہیں ہے۔ شوکت سبزواری کے ایک شاگرد نے لکھاہے کہ شوکت صاحب وہاں شعبۂ اردو میں لیکچرر تھے۲۶۔خودشوکت سبزواری نے لکھا ہے کہ ان کے ڈھاکا یونی ورسٹی جانے سے پہلے بھی عندلیب شادانی وہاں ڈین فیکلٹی اوف آرٹس تھےاوران کے جانے کے بعدبھی رہے۲۷۔شادانی وہاں ڈین ہونے کےساتھ ساتھ صدرِ شعبۂ اردوبھی تھے۔نظیر صدیقی نے اپنی کتاب میں دوتین بار نشان دہی کی ہے کہ عندلیب شادانی ڈھاکا یونی ورسٹی میں صدرِ شعبہ 'اردواورڈین بھی تھے۲۸۔ شوکت سبزواری کی کتاب ''اردوزبان کا ارتقا'' کے اندرونی سرورق پران کے نام کے ساتھ''شعبۂ اردو وفارسی، ڈھاکا یونی ورسٹی'' لکھاہے۔گویا شوکت سبزواری ڈھاکا یونی ورسٹی کےشعبۂ اردو و فارسی میں لیکچرر تھےاور مالک رام سے یہاں بھی تسامح ہواہے۔

شوکت سبزواری نے ڈھاکا یونی ورسٹی میں تدریس کےساتھ پی ایچ ڈی کے مقالے پرکام شروع کیاجس کی تیاری وہ پہلے سے کررہے تھےاور۱۹۵۲ء میں انھیں ڈھاکا یونی ورسٹی کی جانب ان کے مقالے''اردوزبان کاارتقا'' پریہ سندتفویض کی گئی۔یہ مقالہ ڈھاکا سے۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔

جب ۱۹۵۸ء میں کراچی میں ترقیٔ اردو بورڈ (جس کانام بعدازاں اردولغت بورڈ کردیا گیا) قائم ہواتومدیر اعلیٰ بابائے اردو مولوی عبدالحق تھے۔ بعد میں ادارتی عملے میں جو لوگ بورڈ میں منتخب ہوئے ان میں شوکت سبزواری بھی تھے۔ چنانچہ وہ ڈھاکا یونی ورسٹی سے استعفا(درست املا استعفا ہی ہے، نہ کہ استعفیٰ) دے کرکراچی آگئے اور بورڈ کے ادارتی عملے میں شامل ہوگئے ۔ مالک رام سے یہاں پھرایک غلطی ہوئی ہے۔انھوں نےلکھاہے کہ۱۹۶۱ء میں مولوی عبدالحق کے انتقال کے بعد''سارے کام کی ذمے داری شوکت صاحب کے کندھوں پرآپڑی۔وہ مدیراعلیٰ بنادیے گئے اورآخرتک اسی عہدے پر متمکن رہے''۲۹۔حقیقت یہ ہے کہ شوکت سبزواری اردولغت بورڈ (جس کانام اس وقت ترقی اردو بورڈ تھا) میں کبھی بھی مدیر اعلیٰ نہیں رہے۔ وہ ۱۹۶۴ء میں ''مدیراول'' بنائے گئے۔ ثانیاً، کام کی ساری ذمے داری ان پرنہیں شان الحق حقی پرتھی جو بورڈ کے سیکرٹری تھےاور بابائے اردو کے بعد معتمد کی ذمے داریوں کے ساتھ عملاً بورڈ کے مدیر اعلیٰ کے

فرائض بھی ادا کرتے رہے۔حقی صاحب استعفا دینے (۱۹۷۶ء) تک اس عہدے پر رہے اور شوکت سبزواری آخر تک یعنی اپنے انتقال (۱۹۷۳ء) تک مدیر اول ہی رہے۔ ممتاز حسن صاحب بورڈ کے صدر تھے لیکن ظاہر ہے کہ ان کی سرکاری منصبی ذمے داریاں ان کے پابندی سے بورڈ کے دفتر آنے میں مانع تھیں ۔ممتاز حسن صاحب بورڈ کے دفتر آتے ضرور تھے لیکن بیشتر اختیارات اور اہم کارِ منصبی حقی صاحب کے ذمے تھے۔حقی نے سترہ (۱۷) برس تک بلا معاوضہ بورڈ کی خدمت کی اور مجبوراً استعفا دیا (ویسے بھی بورڈ میں دو گروپ بن گئے تھے اور شوکت سبزواری انجمن ترقی اردو کے نمائندے اور بابائے اردو کے گروپ کا حصہ سمجھے جاتے تھے جن کے حقی صاحب سے بعض معاملات میں اختلافات تھے۔لیکن اس کی تفصیل پھر کبھی سہی)۔حقی صاحب کے معتمد ہوتے ہوئے بورڈ میں کوئی اور نہ مدیرِ اعلیٰ تھا اور نہ مدیرِ اعلیٰ کی ذمے داریاں ادا کرتا رہا۔ درحقیقت اگر بورڈ کو حقی صاحب جیسا دانش مند، ماہر زبان اور لغت کا شیدا نہ ملتا تو لغت کے اس عظیم منصوبے کا آگے چلنا بہت مشکل ہوتا۔ اگرچہ شوکت سبزواری کی مہارت اور اہلیت میں بھی کوئی شبہ نہیں۔

بے شک حقی صاحب کے ساتھ بڑی تعداد میں اہل علم اور اہل قلم تھے اور انھوں نے بطور بیرونی اسکالر بورڈ کے کاموں میں ان کی مدد کی۔شوکت سبزواری صاحب بورڈ کے باقاعدہ ملازم تھے اور ان کے ذمے بنیادی طور پر لفظوں کا اشتقاق لکھنا تھا۔سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ اور ان کی تاریخ اور اشتقاق پر ان کی جیسی نظر تھی اس لحاظ سے یہ ان ہی کو سجتا تھا۔ بہرحال، شوکت سبزواری بورڈ میں مدیر اول تھے اور ۱۹۶۴ء سے اپنے انتقال (۱۹۷۳ء) تک مدیر اول کے منصب پر فائز رہے نہ کہ مدیرِ اعلیٰ کے عہدے پر۔ان کے بعد ۱۹۷۵ء میں نسیم امروہوی اس عہدے پر فائز ہوئے۔بورڈ کے نفس ناطقہ ''اردو نامہ'' کے شمارے اس کے گواہ ہیں اور بورڈ کی لغت کی جلدیں بھی۔لغت کی ساتویں جلد سے ''مدیر اول، شوکت سبزواری (مرحوم)'' بورڈ کی لغت کی تمام جلدوں پر لکھا جاتا رہا ہے۔ساتھ ہی مدیرِ اعلیٰ کا عہدہ اور نام الگ سے لکھا جاتا رہا ہے۔اس کے بعد انھیں ''مدیرِ اعلیٰ'' قرار دینے کا کیا جواز ہے؟ مالک رام نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے انتقال تک لغت کی ایک بھی جلد منظرِ عام پر نہ آسکی تھی لیکن ''آٹھ جلدیں مکمل ہو چکی تھیں''۳۰۔ یہ بات تو درست ہے کہ لغت کی پہلی جلد ۱۹۷۷ء میں یعنی شوکت سبزواری کے انتقال کے بعد ہی شائع ہوئی لیکن آٹھ جلدیں مکمل ہونے کی بات متنازع فیہ ہے اور اس بات کا کوئی حتمی ثبوت نہیں ہے کہ اس وقت تک کتنی جلدیں مکمل ہو چکی تھیں۔نیز اشاعت کے وقت ''تیار'' جلدوں پر بھی خاصی تنقیح و تحقیق کے بعد بہت زیادہ اضافے اور ترامیم و تنسیخ ہوتی رہی لہٰذا ''مکمل'' کہنا بھی درست نہیں (اس کی تفصیل کا بھی یہ موقع نہیں، بورڈ کی تاریخ جب لکھی جائے گی تو اس میں یہ ذکر آئے گا)۔

لسانی وتنقیدی خدمات

شوکت سبزواری کی اصل شہرت ان کے لسانی کاموں کی بنا پر ہے۔اس سلسلے میں ان کا پہلا کام ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جو ''اردو زبان کا ارتقا'' کے عنوان سے ڈھاکا سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اردو مسلمانوں کی ساختہ نہ سہی پرداختہ ضرور ہے اور یہ سمجھنا درست نہیں کہ مسلمانوں کی ہندوستان آمد سے قبل اردو کا وجود ہی نہ تھا

نیز یہ کہ یہ خیال بھی غلط ہے کہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی۔البتہ اردو اور برعظیم پاک و ہند کی کئی زبانوں کا تہذیبی اور ادبی سرمایہ مسلمانوں کا عطا کردہ ہے۔

تاریخی لسانیات کی بحثوں میں بالعموم سنسکرت کے بعد شورسینی پراکرت کا ذکر ہوتا تھا اور پھر بتایا جاتا تھا کہ یہ پراکرتیں ارتقا پا کر اپ بھرنش بن گئیں اور پھر ان سے مختلف زبانیں اور بولیاں مثلاً پنجابی، راجستھانی، برج بھاشا اور کھڑی بولی وغیرہ بنیں۔ایک خیال یہ بھی تھا کہ اپ بھرنش کا ایک روپ مغربی ہندی تھی اور اس سے بولیاں نکلی تھیں مثلاً کھڑی بولی، ہریانی، قنوجی، بندیلی (بندیل کھنڈی) اور برج بھاشا وغیرہ اسی مغربی ہندی سے نکلی ہیں۔شوکت سبزواری نے اس مقالے میں ایک تو یہ خیال ظاہر کیا کہ مغربی ہندی کا کوئی وجود نہ تھا اور بقول ان کے ''یہ ایک طرح سے فرضی اور خیالی زبان ہے''۳۱۔ دوسرا یہ کہ انھوں نے لکھا کہ اردو کی صرفی اور نحوی خصوصیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''اردو کا ماخذ شورسینی پراکرت یا اپ بھرنش نہیں''۳۲۔ان کا خیال تھا کہ اردو قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک ہے۔پالی بھی اسی کی ترقی یافتہ ادبی شکل ہے اور ''اردو اور پالی کا منبع ایک ہے''۳۳۔ان کے اس مقالے کے بعض مندرجات سے بعض لوگوں کو مغالطہ ہوا کہ شوکت سبزواری اردو کی ابتدا پالی پراکرت سے جوڑ رہے ہیں اور پالی کو اردو کا منبع قرار دے رہے ہیں۔لیکن یہ خیال درست نہیں تھا۔

اردو کی تاریخ پر اپنی دوسری کتاب ''داستانِ زبانِ اردو'' میں شوکت سبزواری صاحب نے اپنے ان لسانی نظریات کو واضح کیا جو اردو کی ابتدا سے متعلق تھے اور ان کی بنیاد تاریخی لسانیات کا گہرا مطالعہ اور سنسکرت سے واقفیت تھی۔ اس میں انھوں نے نہ صرف اردو کے آغاز سے متعلق بعض نظریات کو رد کیا بلکہ بڑی وضاحت سے اردو کا ماخذ بھی بتایا۔ انھوں نے محمد حسین آزاد کے اس نظریے کو رد کر دیا کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے، انھوں نے اس غلط خیال کو بھی مسترد کر دیا کہ اردو لشکری زبان ہے اور یہ بھی کہا کہ یہ نظریہ بھی غلط ہے کہ اردو مختلف زبانوں مثلاً پراکرت اور عربی فارسی وغیرہ کے ملنے سے بنی ہے۔انھوں نے واضح کیا کہ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جو دو یا زیادہ زبانوں سے مل کر بنی ہو کیونکہ کوئی زبان آس پاس کی بولیوں سے توانائی اور ذخیرۂ الفاظ تو لے سکتی ہے لیکن کسی اور زبان سے مل کر نئی زبان نہیں بن سکتی۔زبان کے بننے میں صدیاں لگتی ہیں اور کسی خاص بولی کے ارتقا کے بعد وہ زبان بنتی ہے گو اس کی اپنی صرفی اور نحوی خصوصیات بھی بڑی حد تک برقرار رہتی ہیں۔انھوں نے اس نظریے کی بھی دلائل کے ساتھ تردید کی کہ اردو پنجابی سے نکلی ہے۳۴۔

''داستان زبان اردو'' میں شوکت سبزواری لکھتے ہیں کہ اردو اس کھڑی بولی سے ارتقا پا کر بنی ہے جو گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی میں دہلی اور میرٹھ کے مضافات میں بولی جاتی تھی۔ان کا خیال ہے کہ کھڑی بولی کا آغاز مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہو گیا تھا گویا یہ مسلمانوں کی آمد سے قبل بھی بولی جاتی تھی البتہ مسلمانوں کی آمد کے بعد اس میں بڑی تبدیلیاں ہوئیں اور اس نے مختلف بولیوں اور زبانوں سے ذخیرۂ الفاظ لیا لیکن اس کی بنیادی صرفی و نحوی خصوصیات وہی رہیں۔ان کا خیال ہے کہ اردو کے ارتقا میں سے مغربی ہندی کو نکال دینا چاہیے اور اردو اور پراکرت کی درمیانی کڑی اپ بھرنش ہے۔بعد میں گیان چند جین نے بھی شوکت سبزواری کے نظریے سے بڑی حد تک اتفاق کیا۔ وہ بھی اردو کی ابتدا کھڑی بولی سے مانتے ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ کھڑی بولی کے آغاز کی منزل اور اس میں عربی فارسی الفاظ کے شمول کے

مرحلے پر غور کرنا چاہیے۔اس ضمن میں مسعود حسین خان کا نظریہ کہ اردو دہلی اور اس کے مضافات کی بولیوں کی ترقی یافتہ شکل ہے بھی قابلِ غور ہے۔ البتہ اس میں مسعود صاحب نے کچھ ترمیم بھی کی۔ پہلے مسعود صاحب کا خیال تھا دہلی کے نواح کی بولیوں بالخصوص ہریانی کے براہِ راست اثرات سے ارتقا پاکر اردو بنی اور اس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑے۔ لیکن ۱۹۸۷ء کے بعد ان کا نظریہ تبدیل ہوگیا اور انھوں نے ہریانی کی بجائے کھڑی بولی کو ترجیح دیتے ہوئے لکھا کہ اردو کی تشکیل براہِ راست کھڑی بولی اور ہریانوی کے زیر اثر ہوئی۔ اس کتاب کے ۱۹۸۷ء کے بعد چھپنے والے ایڈیشن (ساتویں ایڈیشن) میں یہ تبدیلی نظر آتی ہے۔اس کی تفصیل مرزا خلیل بیگ نے اپنی کتاب ''اردو کی لسانی تشکیل''میں دی ہے[۳۵]۔ گویا مسعود حسین خان جیسے ماہر لسانیات اور گیان چند جیسے عالم فاضل نے بھی اس امر کا اعتراف کیا کہ شوکت سبزواری کا نظریہ کہ اردو کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکل ہے ،درست ہے[۳۶]۔ مسعود صاحب کو اپنے مقالے میں (جس پر انھیں پی ایچ ڈی ملی تھی) کوئی چالیس برس کے بعد ترمیم کرنی پڑی۔اس نظریے کو سب سے پہلے شوکت سبزواری ہی نے پیش کیا تھا۔اس سے بڑا عملی خراجِ تحسین شوکت سبزواری کے لیے اور کیا ہوگا؟

شوکت سبزواری لسانیات پر ایک اور اہم کتاب ''اردو لسانیات'' ہے۔اس میں انھوں نے اردو کی اصل اور اس کی ابتدا اور اس کے ارتقا کے علاوہ اردو کی صرفی ،نحوی اور صوتیاتی خصوصیات بھی تاریخی تناظر میں بیان کی ہیں۔اس میں انھوں اردو کی ہائیہ یعنی aspirated آوازوں پر بھی بحث کی ہے جو دو چشمی ھ سے لکھی جاتی ہیں۔انھوں نے بتایا ہے کہ یہ ہائیہ آوازیں اصل میں ایک صوتیہ یا ایک آواز (phoneme) ہیں اور ''گھر'' اور ''بھر'' جیسے الفاظ میں جو ہائیہ آوازیں ہیں ان کی بنا پر ان کا املا گ۔ہ۔ر۔ اور ب۔ہ۔ر۔ نہیں بلکہ گھ۔ر۔ اور بھ۔ر۔ ہے اور ان کو توڑ کر لکھتے وقت خیال کرنا چاہیے کہ یہ مخلوط آوازیں یا مخلوط صوتیے (phoneme) ہیں [۳۷]۔ لیکن افسوس کہ آج اس کتاب کی اشاعت کے پچاس سال بعد بھی ہمارے اسکولوں میں ''حروف توڑیئے'' اور ''حروف جوڑیئے'' پڑھاتے وقت ان ہائیہ آوازوں کا غلط املا بچوں کو پڑھایا جا رہا ہے حالانکہ اس طرح (یعنی گھ اور بھ کی بجائے گ۔ہ اور ب۔ہ) لکھنے سے ان الفاظ کا تلفظ گھر اور بھر کی بجائے ''گہر'' اور ''بہر'' ہوجاتا ہے۔

''لسانی مسائل'' شوکت سبزواری کی وہ کتاب ہے جس میں لسانیات اور اردو زبان کی ساخت و خصوصیات پر اہم مضامین ملتے ہیں جن میں وہ دادِ تحقیق دیتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ایک مضمون میں لفظ ''باورچی'' کی اصل پر عالمانہ انداز میں روشنی ڈالتے ہیں[۳۸]۔

افسوس کہ اردو قواعد پر ان کی کتاب ادھوری رہ گئی اور اسی نامکمل حالت میں چھپی[۳۹]۔ اگر یہ مکمل ہوتی تو شاید نئی اردو قواعد لکھے جانے کے لیے انقلابی محرک ثابت ہوتی کیونکہ اردو قواعد اب تبدیلیوں کی متقاضی ہے تاکہ فارسی اور عربی کی قواعد کے تتبع میں لکھی گئی روایتی اردو قواعد کو بہتر اور وقت سے ہم آہنگ بنایا جاسکے۔

شوکت سبزواری کی ادبی تنقید پر مبنی کتابوں میں سے ایک یعنی ''معیار ادب'' کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔تنقیدی مضامین پر مبنی ان کی ایک اور کتاب ''نئی اور پرانی قدریں'' [۴۰] ہے۔ اس میں شامل بعض مضامین ادب کی ہیت اور موضوعات پر بھی ہیں اور ہمارے اکابر ادب پر بھی۔ان میں سے اکبر، حالی اور اقبال پر لکھے گئے مضامین پڑھ کر شوکت سبزواری کے بارے میں مالک رام کی اس رائے کی مزید تردید ہوجاتی ہے کہ وہ کانگریس کے حامی قوم پرست تھے۔

شوکت سبزواری کا کراچی میں ۱۹ر مارچ ۱۹۷۳ء کو انتقال ہوا۔

آج ان کے انتقال کے تقریباً پینتالیس سال بعد بھی ان کی لسانی تحقیق اور لسانیات کے ضمن میں ان کے بعض نظریات اہمیت کے حامل ہیں اور ان سے آج بھی روشنی حاصل کی جاسکتی ہے۔

حواشی:

۱۔ مالک رام ،تذکرۂ معاصرین ، جلد ۲، (دہلی: مکتبۂ جامعہ، ۱۹۷۶ء)،ص ۱۳۵۔ مالک رام کی کتاب تذکرۂ معاصرین کی چار جلدوں کو راول پنڈی سے الفتح پبلی کیشنز نے ۲۰۱۰ء میں ایک جلد میں شائع کیا۔لیکن یہاں بوجوہ پہلے ہندوستانی ایڈیشن سے استفادہ کیا گیا ہے۔
۲۔ ایضاً۔
۳۔ ایضاً۔نیز سنجیدہ خاتون نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر سید معین الرحمن نے بھی شوکت سبزواری کا سال پیدائش ۱۹۰۸ء لکھا ہے لیکن وہ یہ نہیں بتاتیں کہ سال کی نشان دہی معین صاحب نے کس رسالے یا کتاب میں کی ہے، دیکھیے: بیسویں صدی (نصفِ اول) کے اردو مصنفین (دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۲۰۰۸ء)،ص ۲۳۹۔
۴۔ شوکت سبزواری،نقوش ،لاہور، آپ بیتی نمبر، جون ۱۹۶۴ء ،جلد دوم،ص ۱۱۵۰۔
۵۔ ایضاً۔
۶۔ تذکرۂ معاصرین،محولہ بالا،ص ۱۳۶۔
۷۔ نقوش،لاہور،آپ بیتی نمبر، جون ۱۹۶۴ء،جلد دوم،ص ۱۱۵۱۔
۸۔ ایضاً۔
۹۔ تذکرۂ معاصرین،محولہ بالا،ص ۱۳۷۔
۱۰۔ نقوش،لاہور،آپ بیتی نمبر،محولہ بالا،ص ۱۱۵۱۔
۱۱۔ مالک رام،تذکرۂ معاصرین،محولہ بالا،ص ۱۳۷۔
۱۲۔ شوکت سبزواری،نقوش،لاہور،محولہ بالا،ص ۱۱۵۲۔
۱۳۔ مالک رام،تذکرۂ معاصرین،محولہ بالا،ص ۱۳۸۔
۱۴۔ شوکت سبزواری،نقوش،لاہور،محولہ بالا،ص ۱۱۵۳۔
۱۵۔ ایضاً۔
۱۶۔ ایضاً،۱۱۵۴۔
۱۷۔ مالک رام،تذکرۂ معاصرین،محولہ بالا،ص ۱۴۱۔
۱۸۔ مالک رام،محولہ بالا ص ۱۴۱؛ نیز شوکت سبزواری ،محولہ بالا،ص ۱۱۵۴،۱۱۵۵۔
۱۹۔ شوکت سبزواری،محولہ بالا،ص ۱۱۵۵،۱۱۵۶۔
۲۰۔ ایضاً،ص ۱۱۵۸۔۱۱۵۵
۲۱۔ ایضاً۔
۲۲۔ ایضاً۔
۲۳۔ مالک رام،محولہ بالا،ص ۱۴۰۔
۲۴۔ شوکت سبزواری،معیارِادب (کراچی:مکتبۂ اسلوب،۱۹۶۱ء)۔
۲۵۔ مالک رام،محولہ بالا،ص ۱۴۰۔
۲۶۔ شکور عظیم ،سید ، مضمون ''ڈاکٹر شوکت سبزواری'' مشمولہ نقوش ،لاہور،شخصیات نمبر،جنوری ۱۹۵۵ء،جلد اول، ص ۳۶۹۔
۲۷۔ شوکت سبزواری ، مضمون ''عندلیب شادانی ، مشمولہ نقوش ،شخصیات نمبر،جنوری ۱۹۵۵ء،جلد اول،ص ۳۶۳۔
۲۸۔ دیکھیے نظیر صدیقی کی کتاب: ڈاکٹر عندلیب شادانی: ایک مطالعہ، (کراچی:مکتبۂ اسلوب،۱۹۸۵ء)، ص ۱۲،۴۶
۲۹۔ مالک رام،محولہ بالا،ص ۱۴۲۔
۳۰۔ ایضاً،ص ۱۴۳۔
۳۱۔ شوکت سبزواری، اردو زبان کا ارتقا (ڈھاکا:پاک کتاب گھر، ۱۹۵۶ء)،ص ۸۲۔
۳۲۔ ایضاً ص ۸۴۔
۳۳۔ ص ۸۷۔
۳۴۔ ملاحظہ ہو: داستان زبان اردو، (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۷ء)(اشاعتِ ثانی) بالخصوص تیسرا اور چوتھا باب۔۳۵۔ مرزا خلیل احمد بیگ،اردو کی لسانی تشکیل،(کراچی: ادارۂ یادگارِ غالب،۲۰۱۵ء)،ص ۴۶۔۴۴
۳۶۔ گیان چند جین،لسانی مطالعے (دہلی: ترقی اردو بیورو،۱۹۹۱ء)، تیسرا ایڈیشن۔
۳۷۔ شوکت سبزواری، اردو لسانیات (کراچی: مکتبۂ تخلیق ادب، ۱۹۶۶ء)ص ۵۷۔
۳۸۔ شوکت سبزواری کی کتاب : لسانی مسائل (کراچی: مکتبۂ اسلوب،۱۹۶۲ء)۔
۳۹۔ شوکت سبزواری ، اردو قواعد (کراچی: مکتبۂ اسلوب ، ۱۹۸۷ء)،طبع دوم۔
۴۰۔ شوکت سبزواری،نئی اور پرانی قدریں (کراچی:مکتبۂ اسلوب، ۱۹۶۱ء)

☆☆☆